شورش کاشمیریؒ

سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ

مولانا ابوالکلام آزادؒ کے پیرائیہ بیان کو ملحوظ رکھیں تو سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ ستمبر ۱۸۹۲ء مطابق ربیع الاول ۱۳۱۰ھ میں ہستیٔ عدم سے اس عدم ہستی نما میں وارد ہوئے اور ''تہمتِ حیات'' سے متہم۔ ددھیال کی طرف سے عطاء اللہ اور ننھیال کی جانب سے شرف الدین احمد نام رکھا گیا۔ عوام نے ''ڈنڈے والا پیر'' کہنا شروع کیا۔ عقیدت مند صرف شاہ جی کہتے ہیں۔ حضرت علامہ انور شاہ کشمیری نور اللہ مرقدہ نے انجمن خدام الدین لاہور کے سالانہ اجلاس میں ''امیر شریعت'' کا لقب تجویز کیا۔ خود بیعت فرمائی۔ ان کے علاوہ پانچ سو علماء نے بھی بیعت کی، جن میں مولانا ظفر علی خان مدیر ''زمیندار'' بھی شامل تھے۔

اسلافِ خاندان بخارا سے سری نگر وارد ہوئے۔ سلطان زین العابدین والیٔ کشمیر کے زمانہ میں انہیں بڑا رسوخ حاصل تھا۔ ان کی رحلت پر خاندان کی شاخیں ہندوستان کے دوسرے مقامات میں بس گئیں۔ ایک شاخ نے گجرات میں اور دوسری نے پٹنہ میں قیام کیا۔ آپ کے والد بزرگوار کی شادی اسی شاخ کے ایک بزرگ حکیم سید احمد شاہ اندرابی کی دختر فرخندہ اختر سیدہ فاطمہ اندرابی سے ہوئی۔ آپ ابھی بچے ہی تھے کہ انکا انتقال ہوگیا۔ ان کی رحلت پر والد پٹنہ سے گجرات چلے گئے اور دوسری شادی کر لی۔ شاہ جی ننھیال ہی میں رہے جہاں نانی مرحومہ نے بیٹی کی نشانی سمجھ کر بڑی شفقت سے پالا۔ آپ کے نانا ابا کا مقام شعر و ادب کی محفلوں کا مرکز تھا۔ شاد عظیم آبادی آپ کی نانی صاحبہ سے محاورہ اور روزمرہ کی صحت کے لیے تشریف لاتے تھے۔ ان کی صحبتوں سے آپ نے بھی استفادہ کیا۔ رفتہ رفتہ شعر و شاعری اور زبان کا ذوق منجھ گیا۔

غالباً نانی صاحبہ کی وفات پر آپ نے پٹنہ سے گجرات کا قصد کیا۔ اثنائے سفر میں موانعات پیش آتے رہے ایک آدھ جگہ ملازمت بھی کی کچھ دنوں بنارس میں چاندی کے ورق کوٹتے رہے۔ حتیٰ کہ امرتسر پہنچ گئے۔ وہاں مختلف اساتذہ سے قرآن، حدیث اور فقہ پڑھی۔ خوش الحان اور خوش الحانی کا یہ جوہر آپ کو نانا مرحوم سے ورثہ میں ملا تھا۔ وعظ شروع کیا تو سارا امرتسر گرویدہ ہوگیا۔ پہلی جنگ عظیم کے خاتمہ پر اہالئ امرتسر کو گولیوں کا تحفہ ملا تو ملک میں ایک طوفان کھڑا ہوگیا۔ مولانا داؤد غزنوی کی تحریک پر آپ نے تحریک خلافت میں شمولیت اختیار کی۔ دیکھتی آنکھوں تمام ملک میں آپ کی خطابت کا شہرہ ہوگیا۔ حتیٰ کہ ہندوستان میں یہ بات متفق علیہ ہوگئی کہ اردو زبان میں آپ سے بڑا کوئی عوامی خطیب نہیں۔

شاہ جی اور خطابت ہم نشیں ہیں۔ آپ نے تقریباً تیس یا بتیس برس (قید کا زمانہ چھوڑ کر) اس دشت پیمائی میں بسر کیے ہیں۔ برصغیر کی تقریباً دو نسلیں آپ کے لولوئے لالہ سمیٹ چکی ہیں۔ لاکھوں آدمیوں کو آپ کی سیاست سے اختلاف رہا۔ اب بھی اختلاف کرنے والوں کی کمی نہیں لیکن کوئی سا شخص بھی اس سے اختلاف نہیں کرے گا کہ خطابت ان کی لونڈی ہے۔ وہ بولتے نہیں موتی رولتے ہیں۔ ان کی برجستہ گوئی، ان کی حاضر جوابی، ان کی بذلہ سنجی، ان کی نکتہ آفرینی، ان

کی زبان دانی، ان کی شعر وسخن سے دلچسپی غرض:

ہزاروں خوبیاں ایسی کہ ہر خوبی پہ دم نکلے

درحقیقت وہ ایک چلتا پھرتا شرعی انسائیکلو پیڈیا ہیں اردو، فارسی، پنجابی کسی زبان میں بھی ان کی طبیعت بند نہیں وہ ایک بحرِ مواج ہیں۔ان کا کوئی صدف موتی سے خالی نہیں۔بلاشبہ ان کا نام ڈیما ستھینز، سسرو، مینڈبرک، صہبا، ابن غزال اور سعد زاغلول کے ساتھ لیا جاسکتا ہے۔انہوں نے خطابت اختیار نہیں کی بلکہ خطابت نے انہیں اختیار کیا ہے۔برصغیر کی بہت سی تحریکیں انہوں نے جگمگائی ہیں۔وہ زبان و بیان کا ایسا مرقع ہیں جس میں رنگارنگ تصویریں ہیں۔ان کی خطابت کو نگارخانے سے تشبیہ دی جاسکتی ہے۔

ہر گلے را رنگ و بوئے دیگر است

ایک خوبصورت وجود میں عنفوان شباب کی جو رعنائیاں ہوتی ہیں وہ تمام تر انکی خطابت میں ہیں۔انہوں نے اپنے خیالات کی سزا بھی بھگتی ہے، انگریزوں سے بھی اور مسلمانوں سے بھی۔لیکن انگریزوں کی سزائیں ان کی متاع عزیز ہیں۔ مسلمانوں سے انہیں کوئی گلہ نہیں وہ اس کے ڈانڈے تیرہ سو برس کی تاریخ کے مختلف حلقوں سے ملاتے ہیں۔اس وقت ان کی عمر پینسٹھ برس کے لگ بھگ ہے اس حساب سے انہوں نے ہفتہ میں سے ڈیڑھ دن قید و بند میں بسر کیا ہے:

خورد افسوس زمانے کہ گرفتار نہ بود

ان کی نجی محفلیں باغ و بہار ہوتی ہیں:

اک ذرا چھیڑیئے پھر دیکھیے کیا ہوتا ہے

تمام رات بیت جائے گی لیکن وہ بولنے سے نہیں تھکتے اور آپ سننے سے نہیں تھکیں گے۔جب آتش جواں تھا، وہ شروع رات سے پو ٹھنے تک تقریر کرتے اور لوگ تھے کہ نقش کالحجر ہو کر بیٹھے رہتے۔ان کا مضمون زلفِ یار کی طرح پیچ وخم کھاتا ہوا کہیں ختم نہیں ہوتا۔

تنہائی سے انہیں سخت نفرت ہے۔غالباً اس کا تصور ابھی ان کے ہاں نہیں وہ زندگی کو بازار سمجھتے اور بازار ہی پر مرتے ہیں۔لیکن سب سے بڑا عوامی خطیب ہونے کے باوجود عوام کو کالانعام سمجھتے ہیں۔غالباً ان کا خیال ہے کہ رائے عامہ ہوا کی موج یا بادل کا ٹکڑا ہے۔ان کے نزدیک رائے عامہ، نظم معریٰ، پکاراگ، برطانوی سیاست اور غلام احمد کی نبوت عجیب وغریب پہیلیاں ہیں۔

دوستوں پر غایت درجہ اعتماد کرتے ہیں، دشمنوں کو درخورِ اعتنا ہی نہیں سمجھتے۔سیاست میں حصہ لینے کے بعد اب سیاست سے سخت متنفر ہیں۔انہیں انتخاب کے نام سے چڑ ہے۔غیبت کرتے نہ سنتے ہیں۔دل کی دوستی کو دماغ کی دوستی پر ترجیح دیتے ہیں۔چنانچہ اختلاف فکر وعمل کے علی الرغم عبدالمجید سالک، ڈاکٹر محمد دین تاثیر، سید احمد شاہ بخاری (پطرس) اور صوفی غلام مصطفیٰ تبسم کی یاری کا دم بھرتے تھے۔مگر جس زمانہ میں مولانا ظفر علی خان ڈاکٹر شیخ محمد عالم، ڈاکٹر سیف الدین کچلو

وغیرہ سے اتحادِ فکر و عمل تھا ان سے دل کی رسم و راہ کا کوئی معاملہ نہ تھا۔

جماعت احرار سیاست میں ان کی ''مساعی شکست انجام'' کا ثمرہ ہے۔ اب تو خیر حکومت ہی نے اسے خلافِ قانون قرار دے رکھا ہے۔ لیکن ایک زمانہ میں احرار کا طوطی بولتا تھا۔ چودھری افضل حق مرحوم، مولانا مظہر علی اظہر، مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی ایسے لوگ آپ کے دست و بازو تھے۔ اب وہ سبو ٹوٹ چکا، صہبا چھلک گئی، مئے کدہ اجڑ گیا، آب خورے کے ریزوں میں تلچھٹ باقی ہے اور بقول اقبال:

بیا یک لحظہ باعاماں در آمیز
کہ خاصاں بادہ ہا خور دند و رفتند

حسن جہاں کہیں ہو ان کی کمزوری ہے، پلکوں کی سنانوں سے لے کر پھریروں کی اڑانوں تک میں وہ حسن تلاش کرتے اور اس پر مرتے ہیں وہ جذبات کے لیے جیتے اور جذبات پر مرتے ہیں۔ انہیں عمارتی حسن سے قطعاً لگاؤ نہیں۔ تاج محل کو گاندھی جی کے الفاظ میں ''مزدوروں کی بیگار کی یادگار'' کہتے ہیں۔ تمام زندگی سیر و سیاحت میں گزار دی لیکن سیر و سیاحت کے عادی نہیں۔ موٹا جھوٹا پہنتے، سادہ غذا کھاتے اور ہنسی خوشی جیتے ہیں۔ اب کچھ دنوں سے طبیعت بیمار ہے دوستوں کے بچھڑنے کا سخت رنج ہے۔ فرماتے ہیں: ''میاں اب تو دشمن بھی شریف نہیں رہا، شریف دشمن سے لڑنے میں تو لطف آتا تھا۔''

چہرۂ خوش اور آوازِ خوش ان کی طبعی خوراک ہیں۔ گو صوفی منش ہیں لیکن مزامیر کے قائل نہیں، صرف گلے کے رس سے لطف اٹھاتے ہیں۔ شعر و شاعری سے انہیں ایک گونہ دلبستگی ہے تمام اساتذہ کے چیدہ چیدہ شعر ازبر ہیں۔ ان کے با موقع استعمال میں جو خصوصیت انہیں حاصل ہے وہ کسی اور کو نہیں۔ مولانا آزاد کی طرح ان کی حافظہ کی گرہیں بھی طبیعت شگفتہ ہو تو کھلتی اور بکھرتی چلی جاتی ہیں۔ بہ قول شاعر:

وہ اپنی ذات میں اک انجمن ہیں

کبھی سرو قامت تھے۔ اب ان کا قد بھی ان کے دل کی طرح اللہ کے حضور میں جھک گیا ہے۔ چہرہ پر جھریوں کی مسبح عبارتیں، ماتھا کشادہ لیکن تفکر کی کائنات پیشانیوں سے مجروح، آنکھیں.....ایک زمانہ میں ساری مستی شراب کی سی تھی.....اب چپ چاپ، گویا کچھ سوچ رہی ہیں۔ لہجہ میں عرب شہسواروں کا بانکپن، قرآن پڑھیں تو قرنِ اوّل کا مدینۃ النبی یاد آجاتا ہے۔ شعر سنائیں تو عجمی درباروں کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد کے الفاظ میں:

''دنیا کسی کے لیے کبھی نہیں بدل سکتی۔ تمام زندگی نصف افسانۂ امید اور نصف ماتم یاس ہے.....''

اب اس مرحلہ میں:

مختصر حالِ چشم و دل یہ ہے
اس کو آرام اس کو خواب نہیں

(''نقوش''، شخصیات نمبر۔ جنوری ۱۹۵۵ء۔ ص ۱۲۱۴ تا ۱۲۱۶)